یا تو اُس پر ایک ڈرامہ چل رہا تھا جس میں صرف دو کردار تھے۔ ایک یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ اور دوسرا شاہ جی کا کردار تھا۔

سٹوڈنٹ پوچھتا ہے ''شاہ جی! آپ جدی پشتی زمیندار ہیں یا آپ نے انگریزوں سے زمینیں حاصل کی تھیں؟''

شاہ جی کہتے ہیں ''میں لعنت بھیجتا ہوں انگریزوں سے زمینیں لینے والوں پر۔ ہم تو جدی پشتی زمیندار ہیں۔''

سٹوڈنٹ کہتا ہے ''وہ کیسے جی؟''

شاہ جی بتاتے ہیں ''میرے لکڑ دادا کے دوست اکبر بادشاہ کے دربار میں وزیر تھے۔ اُنھوں نے میرے لکڑ دادا سے کہا کہ اگر آپ دینِ الٰہی قبول کر لو تو ہم بہت سی زمینیں تمہارے نام کر دیں گے۔ میرے لکڑ دادا کیونکہ بہت پڑھے لکھے تھے اس لیے اُنھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔''

وہ کیوں جی؟'' سٹوڈنٹ پوچھتا ہے۔

شاہ جی بتاتے ہیں ''وہ اس لیے کہ دینِ الٰہی کو قبول کرنے کے لیے ایک ٹسٹ سے گزرنا پڑتا تھا جس میں ایک کتے کی زبان کو شہد لگا دیا جاتا تھا اور جو بھی اُس کتے کی زبان پر لگا شہد چاٹ لیتا وہ دینِ الٰہی میں داخل ہو جاتا۔ میرے دادا کیونکہ بہت پڑھے لکھے تھے اس لیے اُنھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔''

''پھر کیا ہوا جی؟'' سٹوڈنٹ نے پوچھا۔

''وہ وزیر کیونکہ میرے دادا کے دوست تھے اس لیے اُنھوں نے اس شرط میں تبدیلی کر دی وہ یہ کہ اُنھوں نے شہد میرے دادا کی زبان کو لگا دیا اور کتے نے میرے دادا کے کندھوں پر اپنی اگلی ٹانگیں رکھ کر دادا کی زبان پر لگا شہد چاٹ لیا۔ تو اس طرح ہم تو جدی پشتی زمیندار بن گئے اور ہم انگریزوں سے زمینیں حاصل کرنے والوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔''

یہ تلقین شاہ کا وہ پروگرام تھا جو خاں صاحب نے ٹی وی کے لیے لکھا تھا۔ اس پروگرام کے کچھ اور حصے بھی ٹی وی پر چلے لیکن ان میں بھارت اور امریکہ کے بجائے اپنے ہی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر تنقید بڑی سخت تھی اسی لیے اس پروگرام کو جلد ہی بند کر دیا گیا۔ اس پروگرام کا لکھنے والا اگر پیسہ کمانا چاہتا تھا یا صرف شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا تو پھر وہ کڑی تنقید کرنے کے بجائے بآسانی ہلکے پھلکے موضوعات کا انتخاب کر سکتا تھا' لیکن اُس نے کبھی کسی مصلحت کو فن کے آڑے نہیں آنے دیا۔

''تلقین شاہ'' سے لے کر ''من چلے کا سودا'' تک کے مکالمات میں مجھے ایک ہیرو نظر آتا ہے۔ کوئی ہیرو ہمیں کیوں اچھا لگتا ہے؟ دراصل وہ ڈر اور خوف کی حدیں پھلانگ کر ایسے ایسے کارنامے کر جاتا ہے جس کا عام زندگی میں ہم تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں ہیرو اچھا لگتا ہے۔ ''من چلے کا سودا'' میں موجود ہیرو جہادِ اکبر کرتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ میں خود اس جہاد میں حصہ لینے کے بارے سوچنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا اس لیے وہ ہیرو میرا بھی پسندیدہ ہیرو بن جاتا ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اشفاق صاحب کا مشہور ٹی وی پروگرام ''زاویہ'' کتابی صورت میں مرتب ہو رہا

تھا اور میں اس کی پروف ریڈنگ کر رہا تھا۔ مجھے اُن کی مکمل رہنمائی حاصل رہی۔ میں جب کتاب ''زاویہ'' کا پہلا پرنٹ لے کر خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے ''کیا ہو رہا ہے آج کل؟''

میں نے عرض کی ''خاں صاحب! ''زاویہ'' کی پروف ریڈنگ کر رہا ہوں۔''

بڑے خوشگوار موڈ میں فرمانے لگے ''بھئی تم تو ہم پر تھانے دار لگ گئے ہو۔ ہمارا لکھا چیک کیا کرو گے اور ہماری غلطیاں پکڑا کرو گے۔''

یہ اُن کی محبت کا ایک خاص انداز تھا ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ غلطیاں دونوں سے ہوتی ہیں۔ کمپوزر سے بھی اور پروف ریڈر سے بھی۔ جہاں تک خاں صاحب کی غلطیوں کا معاملہ ہے تو میں نے اُن کے دستی لکھے ہوئے بہت سارے مسودات دیکھے ہیں۔ پہلے لفظ سے لے کر آخری حرف تک مجھے کبھی ایک کٹنگ بھی نظر نہیں آئی اور میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ خاں صاحب نے کبھی رف مسودہ تحریر نہیں کیا اس لیے بعد میں اُسے نیٹ کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

بات ہو رہی تھی ''زاویہ'' کے پہلے پروف کی۔ ہر بڑی تخلیق کے پیچھے اس کی ایڈیٹنگ کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ ''ویسٹ لینڈ'' جیسی بڑی نظم بھی ایڈیٹنگ کے بعد ہی منظرِ عام پر آتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر بڑا ادیب ایک ایڈیٹر بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ ''زاویہ'' کی پروف ریڈنگ کا اعزاز مجھے حاصل رہا لیکن اس کی ایڈیٹنگ خاں صاحب نے خود کی تھی۔ یہ ایک بڑا کام تھا اور اسے ایک بڑا آدمی ہی کر سکتا تھا۔

خاں صاحب کی ایڈیٹنگ کرنے کے بعد کتاب میں شامل ہر عنوان ایک مکمل قصے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ قصے جو لطف تو افسانے کا دیتے ہیں لیکن Base وہ Reality پر کرتے ہیں۔ ''زاویہ'' میں تصوف کے مسائل پر بحث نہیں کی گئی بلکہ یہ زندگی کی اُن چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کے منظرنامے ہیں جن کو عام آدمی بڑی آسانی سے نظر انداز کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ محسوس بھی نہیں کرتا۔

بڑے فنکار کا یہ کمال ہوا کرتا ہے کہ وہ چھوٹی اور معمولی باتوں کو ہمیشہ بڑے تناظر میں پیش کرتا ہے اور بڑے سلیقے سے بیان کرتا ہے کہ اُسے پڑھنے کے بعد وہ حقیقت جو بڑی معمولی اور غیر اہم سی لگتی ہے آپ کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر کبھی آپ اُس حقیقت سے نظریں چرانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تب بھی اُسے احساس کے پرے دھکیلنا آپ کے لیے مشکل ضرور ہو جائے گا۔

ایک دفعہ جب خاں صاحب کی طرف جانا ہوا تو رکشے والے سے بڑی بحث ہوئی۔ 121۔سی پہنچ کر رکشے والے نے کرایہ ادا کیا تو اُس کے پاس چینج نہیں تھا۔ میں نے اُس سے پانچ روپے بقایا لینے تھے۔ بڑی دیر تکرار ہوتی رہی۔ پاس کوئی دکان بھی نہیں تھی جہاں سے چینج مل سکتا۔ آخر میں اُسے صابری کی دکان پر لے گیا اور یوں بقایا پانچ روپے لے کر میں نے اُس کی جان چھوڑی۔

جب واپس خاں صاحب کے پاس حاضر ہوا تو انہیں سارا ماجرا بیان کیا۔ سُن کر فرمانے لگے:

''یار! تم نے اُس سے بقایا کا تقاضا ضرور کرنا تھا۔ وہ پانچ روپے بھی اُسے دے دیتے'' پھر فرمایا ''آئندہ سے بقایا نہ لیا کرو۔ تم نے کون سا اپنے پلے سے دینا ہوتا ہے۔ دیتے میں سے ہی تو دینا ہے۔''

میں خاں صاحب کی اس بات پر ابھی تک عمل پیرا نہیں ہو سکا۔ ایک روپیہ چھوڑ دینا بھی میرے لیے بڑا دشوار ہو جاتا ہے لیکن میرے دل کی یہ تمنا ضرور ہے کہ مجھ پر جلد از جلد ایسا وقت آئے کہ اس پر عمل کرنا میرے لیے آسان ہو جائے۔

جب کبھی میں اپنے گھر پر اکیلا ہوتا یا اپنے دوست احباب کے ساتھ! ہم سب ''زاویہ'' دیکھتے اور سنتے تو ایک عجیب وغریب سحر میں مبتلا ہو جایا کرتے۔ ہمیں لگتا جیسے ہم سب ماضی کے قصہ گوئی کے دور میں واپس چلے گئے ہیں۔ ہم سب اپنی اس واپسی پر بڑا آنند محسوس کرتے تھے اور ہمیں یوں لگتا جیسے یہ داستانی طرز گفتگو ہماری جینز میں پہلے سے کہیں موجود ہے اور خاں صاحب نے اُسے پھر سے دریافت کر لیا ہے۔ اُنہوں نے بڑے منفرد انداز میں ہمارے ماضی کا ورثہ ہمیں لوٹا دیا ہے۔

آج کل لینڈ مافیہ کے ہاتھوں تاریخی عمارتوں کا ورثہ تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ پرانی اور تاریخی جگہوں پر پلازے اور شاپنگ مال تعمیر ہو رہے ہیں۔ تاریخی ورثے کی اہمیت کو اُجاگر کرنے والا کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ایسے میں خاں صاحب نے کم از کم داستان گوئی کے ورثے کو اس انداز سے اپنی تحریروں میں محفوظ کر لیا ہے کہ اب کوئی مافیا بھی اس پر قبضہ نہیں کر سکے گا۔

بہت سارے لوگ ملازمت یا دوسری مصروفیات کے باعث ''زاویہ'' میں شرکت کرنے کے لیے ٹی وی سٹیشن نہیں جاتے تھے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے خاں صاحب نے اپنے گھر پر بھی ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ یہ نشست ہر جمعرات کے روز ہوا کرتی۔ مجھے بھی وہاں حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ ہر طبقہ فکر کے لوگ وہاں آیا کرتے تھے۔ بزنس کلاس، اساتذہ، خواتین، خاص کر نوجوان طبقے کی تعداد زیادہ ہوتی۔ عصر کے وقت ہم وہاں پہنچا کرتے، مغرب کے وقت نماز کا وقفہ ہوتا۔ خاں صاحب نماز کے لیے گھر کے اندر تشریف لے جاتے۔ جب وہ واپس محفل میں آتے تو سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ان محفلوں میں مجھے ایک بات کی بڑی کمی محسوس ہوا کرتی اور میں اکثر سوچا کرتا کہ واصف علی واصف صاحب کتنے خوش نصیب تھے جن کو اشفاق صاحب جیسے سننے والے میسر رہے، لیکن خود اشفاق صاحب کی محفل میں مجھے ایسا کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا جو اُن کے Calibre کے مطابق اُن سے سوال پوچھتا۔ ہم جیسے پوچھنے والوں نے اپنی ذات سے بلند ہو کر کبھی اُن سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

ایک بار کسی نشست میں کوئی خاتون خاں صاحب کو بتا رہی تھی کہ اُس کا شوہر نماز کے بعد دُعا نہیں مانگتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے تو یہ ظاہر ہوگا کہ میں نماز اپنے مطلب کے لیے اللہ سے مانگنے کے لیے پڑھتا ہوں۔

خاں صاحب فرمانے لگے ''بھئی آپ اُسے بتاؤ لیکن سختی سے نہیں نہایت نرمی سے بتاؤ کہ جب عام زندگی میں ضرورت پڑنے پر آدمی اپنے بھائی سے مدد مانگتا ہے یا کسی عزیز رشتے دار سے مانگتا ہے تو پھر اللہ پاک سے مانگنے میں کیسی شرمندگی۔ وہ تو خود فرماتا ہے کہ مجھ سے مانگو اور وہی سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔''

گورنمنٹ کالج کے ایک سٹوڈنٹ نے پوچھا ''سر! میں کالج میں شلوار قمیض پہن کر جاتا ہوں تو لڑکے اور ٹیچر

میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شلوار قمیض پہننے والا جاہل ہوتا ہے۔"

اشفاق صاحب نے اُس طالب علم سے فرمایا "یار! تم اپنے موقف پر تو ضرور کاربند رہو لیکن دوسروں کو سختی سے جواب مت دو۔ تم اُنہیں بڑے دھیرج اور نرمی کے ساتھ بتاؤ کہ سر! میں تو پینٹ شرٹ پہننا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں گھر میں بوڑھے والدین موجود ہیں جنہوں نے بڑی محنت اور محبت سے میری پرورش کی ذمہ داری نبھائی ہے۔ اب مجھے اُن کی خاطر اُن کی خواہش کے احترام کے پیش نظر مجبوراً شلوار قمیض پہننا پڑتی ہے۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں میں انہیں گھر سے نہیں نکال سکتا نا؟"

خاں صاحب کی انہی محفلوں کی بات ہے کہ ایک روز دو نوجوان آئے۔

ڈرائنگ روم کا باہر والا دروازہ کھلتے ہی سامنے جو میز لیمپ نظر آتا ہے اُس کے ساتھ والے صوفے پر خاں صاحب تشریف رکھتے تھے۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو خاں صاحب نے انہیں اپنے پاس بیٹھنے کو جگہ دی اور گفتگو کو جاری رکھا۔ وہ مختلف طرز کے موضوعات پر ایک خاص ربط باہمی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ اُن کی باتوں سے یوں لگتا کہ اُن مختلف موضوعات کا آپس میں کوئی بہت گہرا تعلق موجود ہوتا ہے جسے کوئی قادرالکلام ہی دریافت کر سکتا ہے۔ سننے والے تو ندرتِ کلام کے حصار میں ہوتے تھے۔

اتنے میں مغرب کی نماز کا وقفہ ہو گیا اور اُس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب اُن دونوں کی باری آئی تو اُن میں سے ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"سر! یہ میرا دوست ہے۔ بڑا اچھا ہے بیچارہ۔ اس کے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ یہ بڑے عرصے سے مجھے کہہ رہا تھا لیکن اس کی بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ اس لیے آج میں خاص طور پر اسے اپنے ساتھ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ سر! میرے اس دوست کو مرشد کی تلاش ہے۔ یہ کسی کا مرید ہونا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ اس کی راہنمائی فرمائیں کہ اس کو کیا کرنا چاہیے؟"

اکثر لوگ خاں صاحب سے بابوں کا پتہ پوچھنے آیا کرتے تھے لیکن اُن کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ بابے کا پتہ نہیں پوچھ رہے بلکہ پانی کا گلاس مانگ رہے ہوں یا چائے کا کپ یا پھر کچھ اس طرح "خاں صاحب! فلاں کتاب کی بک شاپ سے ملے گی۔ ذرا ہمیں اُس کا پتہ تو بتائیں پلیز۔"

کسی بک شاپ کے ایڈریس میں اور کسی بابے کے پتے میں یقیناً بڑا فرق ہوتا ہے اور لوگ اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ دراصل خاں صاحب کسی ایسے بابے کا پتہ جانتے ہی نہیں تھے جس نے اپنی کوئی دکان سجا رکھی ہو۔ اُن کا تعلق فقیروں سے تھا جن کے ڈیروں پر مخلوقِ خدا کو سیدھے راستے پر چلنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اُن دونو جوانوں کا معاملہ البتہ مختلف تھا۔ انہوں نے تو اپنا مقصد ہی سامنے رکھ دیا تھا کہ وہ صرف پتہ ہی نہیں پوچھ رہے تھے بلکہ مرید ہونے کے بھی آرزومند تھے۔ اس معاملے میں شہاب صاحب کا موقف قدرے سخت تھا۔ وہ کہا کرتے تھے "یہ زمانہ بیعت ہونے کا نہیں ہے۔"

اس بارے میں پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تبع تابعین کے ہاں مرشدین نہیں تھے۔

بصریؒ حبیب عجمیؒ اور بایزید بسطامیؒ کا کوئی مرشد نہیں تھا۔ جنید بغدادیؒ نے براہِ راست کچھ درس حضرت سری سقطیؒ سے لیے تو پہلی مرتبہ ہمیں پیر و مرشد کا ایک تعلق نظر آیا۔ تو مرشد کا ہونا لازم نہیں ہے مگر جہاں علم میں کمی ہو اور معاملاتِ نفس پیچیدہ ہوں اور شدتِ حواس غالب وہاں اُستادوں کی ضرورت اعتدال کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

وہ نوجوان اپنے آنے کا مقصد بیان کر چکے تھے۔ اب جواب کے منتظر تھے۔ اُن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باقی سب لوگوں کی تجسس بھری نگاہیں بھی خاں صاحب پر یوں مرکوز تھیں جیسے وہ کوئی بازیگر ہوں اور ابھی وہ کسی جانب اشارہ کریں گے تو مرشد نامی کردار سب کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔

تب خاں صاحب نے اپنے بائیں جانب بیٹھے نوجوان سے فرمایا ''بھئی! آپ آج کل کے پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ آپ تو اُستاد کا بھی ٹسٹ لینا شروع کر دیتے ہو۔ مرشد بھی ایک طرح کا اُستاد ہی ہوتا ہے جبکہ ٹسٹ لینا تو اُستاد کا کام ہوتا ہے۔ آپ اگر کسی مرشد کے پاس جاؤ گے بھی تو اُس پر تجربات کرنے لگو گے جیسے میڈیکل کے سٹوڈنٹ لیبارٹری میں خرگوش اور مینڈک وغیرہ پر تجربات کرتے ہیں۔''

خاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ''میرے خیال میں آپ لوگ پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ اپنی سمت درست رکھو۔ دوسروں کی نہیں بلکہ اپنے آپ کو کیونکہ جب ہم دوسروں کو ٹھیک کرنے چل پڑتے ہیں تو پھر اپنا آپ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ جب تمہارے عمل کی درستگی ایک خاص حد تک پہنچ جائے گی تب ایک روز ایسا آئے گا کہ مرشد خود چل کر تمہارے گھر آ جائے گا اور تمہارے دروازے کی کنڈی کھڑکا کر کہے گا کہ میں آ گیا ہوں..... بیعت کرنے کے لیے۔''

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب نے ڈرائنگ روم میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ جمعرات کی محفلوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اب بھی لوگ اُن سے ملنے آتے تو اُن کو کبھی مایوس نہ لوٹنا پڑتا۔ انہیں سیدھا خاں صاحب کے بیڈ روم میں لے جایا جاتا تھا' جہاں وہ اپنی بیماری کے باوجود لوگوں کو اُمید بانٹتے اور حوصلہ دیتے رہتے۔

دراصل 121۔سی میں لوگوں کو ایک ایسا کندھا دستیاب تھا جس پر سر رکھ کر وہ اپنے اپنے دُکھوں پر رویا کرتے تھے اور وہاں وہ سب اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے آیا کرتے تھے۔ مگر پھر دوسروں کے آنسو سمیٹنے والا کندھا بہت بیمار ہو گیا۔ تب اُس نے اپنے بیڈ روم کو ہی ڈرائنگ روم بنا لیا تھا۔

ایک روز جب میں اُس ڈرائنگ روم میں گیا تو خاں صاحب صوفے پر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور پھر میرے اُس افسانے کی تعریف کرنے لگے جو میں نے اُن دنوں لکھا تھا' لیکن میں حیران تھا کہ ایک نئے لکھنے والے کا افسانہ انہوں نے شدید نقاہت کے باوجود پڑھا تھا اور پھر اُس کی حوصلہ افزائی بھی ضروری سمجھی۔ میرے لیے اُن کی شفقت کا یہ ایک انوکھا انداز تھا۔ پتہ نہیں اور کتنوں کے ساتھ وہ اسی طرح پیش آتے تھے یا پھر سب کے سب میری طرح ہی اُن کی محبت کو فقط اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتے ہوں گے۔

پھر بات میرے افسانے سے نور والوں کے ذکر کی طرف چل پڑی تھی۔

میں نے عرض کی ''خاں صاحب! بابا جی نور والے فرماتے ہیں ''نوٹ! دین صراطِ مستقیم ہے جو لوگ سیدھا

سوچتے ہیں وہ دین پر ہیں اور جو لوگ دائرے میں سوچتے ہیں وہ دین سے خارج ہیں۔'' خاں صاحب! مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری سوچ دائرے میں ہی گھومتی رہتی ہے۔ سوچ کی سمت کو سیدھ میں رکھنا مجھے آتا ہی نہیں ہے۔''

خاں صاحب نے مجھ سے پوچھا ''تم جس طرف رہتے ہو وہاں سے تمہیں نہر کتنی قریب پڑتی ہے؟''

میں نے انہیں بتایا ''وحدت روڈ سے ہوتا ہوا میں فیروز پور روڈ پر آتا ہوں اور ایف سی کالج کے پل سے نہر کراس کر کے ماڈل ٹاؤن کی طرف ہو لیتا ہوں۔ پل پر ٹریفک کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ نہر کو دیکھنے اور اُس کے پانی کی روانی یا تلاطم کو محسوس کرنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ مجھے اس ہجوم میں سے گزرتے ہوئے اشارہ بند ہونے سے پہلے پل کو عبور کرنے کی جلدی ہوتی ہے۔

میرے راستے میں نہر تو ہے لیکن میں اس کے ساتھ کوئی خاص گہرا اور مضبوط تعلق استوار نہیں کر سکا۔ اس پر سے روز گزر جاتا ہوں پر اس سے میرا بندھن بس ایسے ہی لمحاتی اور کمزور سا ہے جو میرے احساس پر کوئی دستک نہیں دیتا اور وہ بھی نہایت معمولی اور غیر محسوس آہٹوں پر بھلا کون سا دروازہ کھلتا ہے۔''

خاں صاحب میرا جواب سُن کر خاموش ہو گئے جیسے وہ شاعر جس کے کلام میں نہر ایک علامت ہو اور سننے والا اُس علامت نگاری کو سمجھتا نہ ہو۔ تو شاعر پر خاموشی کا طاری ہونا لازمی امر ہوتا ہے۔ کچھ توقف کے بعد خاں صاحب نے اس خاموشی کو یوں توڑا۔ اُن کے سامنے ٹی وی ٹرالی کے ساتھ والے میز پر لال رنگ کی مکسچر سے بھرا ایک چھوٹا سا گلاس پڑا تھا۔ بالکل اسی رنگ کی مکسچر ہمارے شہر کا ڈاکٹر منان بھی اپنے مریضوں کو دیا کرتا تھا۔ خاں صاحب نے مجھے وہ گلاس اُٹھانے کو کہا۔ میں نے وہ مکسچر انہیں پیش کی تو انہوں نے اُس لال رنگ کے پانی کے دو گھونٹ بھرے اور گلاس مجھے واپس پکڑاتے ہوئے میرے سوال کو دُہراتے ہوئے فرمایا ''کبھی تم اپنے اِردگرد دیکھو تو تمہیں بے شمار ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کی سوچ سیدھی نہیں ہوتی لیکن انہیں ساری زندگی اس کا احساس نہیں ہوتا۔ تم اللہ کا شکر کیا کرو کہ تمہیں کم از کم احساس تو ہے۔ تم سارے دن میں کسی ایک بات پر اپنی سوچ کو سیدھا رکھنے کی کوشش کیا کرو۔ پھر دیکھو تمہارے ہر کام میں کیسے برکت پڑتی ہے۔'' پھر فرمانے لگے ''یار! میں اب کچھ دیر لیٹنا چاہتا ہوں'' وہ اپنے مخصوص بیڈ پر لیٹ گئے اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔

پھر وہ لطیف میموریل شفٹ ہو گئے۔ ایک روز جب میں شام کے وقت لطیف میموریل گیا تو وہاں بانو آپا کے علاوہ اُن کے پاس اور کوئی نہیں تھا۔ ہسپتال سے باہر ٹریفک رواں دواں تھی۔ گھروں کو لوٹتے ہوئے سوار آہستہ رو بوڑھے، زگ زیگ موٹر سائیکل چلاتے اور اشارہ توڑنے کی کوشش کرتے لڑکے، بھری ہوئی بسوں کے ساتھ لٹکے ہوئے مسافر۔ ان میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ اسی فیروز پور روڈ کے کنارے لطیف میموریل میں ایک ایسی نابغہ روزگار ہستی موجود ہے جس نے اُردو ادب کو برسوں اعتبار بخشا ہے۔ آنے والے زمانے میں بہت سے زیادہ صاحب علم تو آتے رہیں گے لیکن اس جیسی انشا پردازی اب کون کرے گا۔ اُس جیسی نثر لکھنا کسی کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔

اُس روز خاں صاحب ہسپتال کے بیڈ پر بیٹھے کسی خاتون کا ذکر کر رہے تھے کہ اُس کے جسم کے مختلف حصوں میں

بہت ساری پتھریاں تھیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اُن پتھریوں کی موجودگی سے اُس خاتون کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات وہ اس طرح سنا رہے تھے جیسے ہماری توجہ خود پر سے ہٹانا چاہتے ہوں یا پھر ہمیں حوصلہ دینا چاہتے ہوں۔

یہ میری خاں صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ اُن کے جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ کس طرح بڑے لوگ اچانک بھرا میلہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ تو میلے سے تھے ہی نہیں بلکہ میلہ اُن کے دم قدم سے آباد تھا۔ اُن کے جانے کے کچھ عرصے بعد بانو آپا نے مجھے چند کتابیں دیں اور کہا ان کو محمد خاں ٹرسٹ کو بھجوا دو۔ یہ کتابیں اُن بہت سی کتابوں کا حصہ تھیں' جو خاں صاحب کی موجودگی میں ہی ٹرسٹ کو بھجوائی جا چکی تھیں۔ اُن باقی رہ جانے والی کتابوں کو پہچانتے ہوئے میں نے بانو آپا سے کہا کہ یہ تو وہی کتابیں ہیں جو خاں صاحب نے ذاتی مطالعے کے لیے منتخب کی تھیں۔

آپا جی کہنے لگیں ''بیٹا! جب ان کو پڑھنے والا ہی چلا گیا تو اب ان کو رکھ کر کیا کریں گے۔ تم انہیں بھی بھجوا دو۔'' اور ان کے ساتھ خاں صاحب کی تمام لائبریری جس میں اُردو اور انگریزی کی ہزاروں نادر و نایاب کتب کا ایک قیمتی خزانہ تھا جو مختلف اداروں کو ڈونیٹ کر دیا گیا' یہاں تک کہ ان کتب کی الماریاں بھی دے دی گئیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ منتخب لوگ جانے کے بعد بھی کس طرح دوسروں کو فیض یاب کرتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

اُن دنوں.....

(راجہ گدھ.....ایک تاثر)

مسعود میاں

اُن دنوں بہت سارے کرداروں سے میرا رابطہ رہا کرتا تھا۔ نائیلہ' شائیلہ' جمیلہ اور پروین۔ ان سب نے بری طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ان سے تعلق کسی گہرے جذباتی سمندر کی بپھری ہوئی موجوں جیسا نہیں تھا بلکہ لق و دق صحرا کی صورت تھا جس کے طوفانی جھکڑوں میں میں پھنس کر رہ گیا تھا اور مجھے ان سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اُن دنوں میرے پاس ڈیلیا ہوا کرتا تھا۔ جب میں شہر میں نکلتا تو اُن میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتی۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ جاننے والوں کی نظروں سے چھپنا بہت مشکل تھا اس لیے میں اکثر و بیشتر ان کے ساتھ دن اور رات کا زیادہ وقت بند کمرے میں بسر کرتا۔ کبھی کبھار بند کمرے کی وحشت سے اُکتا کر میں اُن کے ساتھ ستلج پارک میں چلا جاتا۔ وہ چھوٹا سا پارک تھا جس کی بہت سی زمین اب بھی گھاس کے بغیر ننگی پڑی ہے اور کسی مردہ چیچ کی طرح گرد اُڑاتی رہتی ہے۔

جب میں پارک کی بے کار صبحوں اور ویران دوپہروں سے گھبرا کر شہر کی سڑکوں پر نکلتا تو جھلسا دینے والے گرم لو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے کسی زلف کا سائبان کام نہ آتا۔

نائیلہ شمائلہ میں سے کسی کو میرے ساتھ دیکھ کر لوگ معنی خیز انداز میں مسکراتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید میں کوئی رئیس زادہ ہوں۔ میرے باپ دادا کی بہت بڑی جاگیر ہے جس کا میں وارث ہوں اس لیے مجھے نہ تو ڈگریاں حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی نوکری کی فکر ہے۔

جبکہ میں ایک طرف تو اُن کرداروں کا عادی ہو چکا تھا۔ میرا کوئی دن بھی ان کے بغیر نہ گزرتا اور دوسری طرف میں ان سب سے بہت بور ہو چکا تھا۔ یہ سب ایک جیسی تھیں۔ صرف نام مختلف تھے ورنہ ان سب کے نقش و نگار، چال ڈھال، اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، اُن کا لباس سب ایک جیسے تھے۔ حتیٰ کہ یہ سب کی سب سوچتی بھی ایک ہی طرح تھیں۔ ان سے میری بوریت اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ میں نے یہ تک سوچنا شروع کر دیا کہ میں کوئی ایسا سنگین جرم کروں اور مجھے جیل ہو جائے اور جب مجھے وہاں چکی پیسنی پڑے گی تو شاید اس طرح میں اس یکسانیت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا۔

اُن دنوں میں جس لائبریری میں جایا کرتا تھا اُس کا نام تھا "جاوید لائبریری"۔ یہ اردو روڈ پر واقع تھی۔ پہلی نظر میں تو یہی لگتا کہ شاید لائبریری کا نام بھی "جاوید نامہ" سے متاثر ہو کر ہی رکھا گیا ہو لیکن جب میں نے وہاں موجود کتب کے ذخیرے پر نظر ڈالی تو وہاں علامہ صاحب پر لکھی گئی کتابوں کا کوئی گوشہ نہ تھا۔

اُس زمانے میں کیبل کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ پی ٹی وی کی نشریات بھی رات گئے ناظرین کا ساتھ چھوڑ جاتیں۔ اس لیے لوگ لائبریری کا رُخ ضرور کیا کرتے تھے۔ اکثر لوگ وہاں آ کر کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگاتے شاید ڈر اور خوف کی وجہ سے کہ کسی کتاب کی کوئی سطر اُن کو غور و فکر میں مبتلا نہ کر دے۔ اس لیے وہ زیادہ تر وہاں سے رسالے ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے لے جاتے تھے۔ وہ ان رسائل کو اپنے سرہانے کے ساتھ رکھ لیتے اور جب رات کے وقت سہل پسندوں کو بڑی دیر تک کروٹیں بدلنے پر بھی نیند نہ آتی تب وہ رسالہ اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ پڑھتے وقت انھیں یوں لگتا جیسے کسی نے اُن کو لوری سنانا شروع کر دی ہو۔ تھوڑی دیر بعد سامنے موجود عبارت ان کی نظروں میں دھندلانے لگتی اور وہ رسالہ سائیڈ پر رکھ سو جاتے۔

اُس لائبریری میں خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور اُن کے نام عموماً نائیلہ، شمائلہ، پروین وغیرہ ٹائپ کے ہوا کرتے۔ اس زمانے میں خواتین بڑی تندہی اور جاں فشانی سے لکھ رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ہر ماہ کوئی نیا ناول لائبریری میں موجود ہوتا۔ میں یہ سارے ناول پڑھ چکا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں روز ہی چکر ضرور لگاتا کہ شاید کوئی نئی کتاب آئی ہو۔

لائبریری سے باہر آنے کے لیے جب میں دروازے کی طرف بڑھتا تو دروازے کے ساتھ والی بک شیلف پر اور کتابوں کے ساتھ ایک کتاب پڑی ہوتی تھی۔ میں دروازے سے باہر نکلتے وقت اُسے روز دیکھتا۔ تھوڑی دیر کو اُس کے قریب رُکتا، اُسے اُٹھاتا، اُس کو کھول کر سرسری طور پر دیکھتا اور پھر بند کر کے اُسے اُسی کی جگہ پر واپس رکھ دیتا۔ اُس پر لکھا تھا "راجہ گدھ" اور نیچے لکھنے والی کا نام "بانو قدسیہ"۔

میں نے آج تک کسی خاتون رائٹر کے ناول کا ایسا نام پڑھا ہی نہیں تھا۔ یہ میرے لیے ایک نئی اور انوکھی بات

تھی اور میں اس انوکھی بات کو جاننے کے لیے ابھی تیار نہیں تھا۔

ایک زمانے میں عصمت چغتائی سے پہلے عورتیں مردوں کے قلمی ناموں سے لکھا کرتی تھیں۔ جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں شاید کچھ کمرشل لکھنے والوں نے خواتین کے نام سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

بہت دن تک جب کوئی نئی کتاب نظر نہیں آئی تو ایک روز لائبریری سے نکلتے ہوئے اُس بک شیلف کے پاس رُک کر جس پر ''راجہ گدھ'' پڑا ہوتا تھا' میں نے فیصلہ کیا کہ اگر یہ کتاب اتنی Interesting ہوئی کہ پڑھنے والے کو مجبور کر دے اور پڑھنے والا اسے مکمل پڑھے بغیر رہ نہ سکے' تو میں اسے پڑھوں گا' ورنہ اُسے واپس کر دوں گا' بغیر پڑھے..... اور مجھ سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا کہ یہ کتاب آپ نے کیوں نہیں پڑھی۔ حتیٰ کہ مصنف بھی نہیں کیونکہ لکھنے والے کا تو یہ مسئلہ ہی نہیں ہوتا کہ کون اس کی کتاب کو پڑھتا ہے اور کون نہیں اور یہ اس کتاب کے نام سے بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مصنف کو پڑھنے والوں کی اتنی فکر ہوتی تو پھر کتاب کا نام بھی..... نائیلہ' ثمائیلہ یا پھر ''بے وفائی کا زخم'' وغیرہ ہوتا۔

جب میں ''راجہ گدھ'' لے کر لائبریری سے باہر نکلا تو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے آس پاس موجود بے شمار قباحتیں جو مجھے دُھندلی دُھندلی دکھائی دیتی ہیں' اُسے پڑھ کر اور زیادہ واضح نظر آنے لگیں گی اور لاپروائی میں بسر ہونے والے شب و روز میں جو ایک سہل پسندی ہوتی ہے وہ عنقریب ختم ہو جانے والی ہے۔

جب میں نے ''راجہ گدھ'' پڑھنا شروع کیا تو اُن دنوں موسمِ سرما اپنے عروج پر تھا۔ ہم جس خطے میں رہتے ہیں یہاں موسموں میں بڑی شدت پائی جاتی ہے اور یہی شدت پسندی جب ہمارے مزاجوں میں بھی در آتی ہے تو شاید وہیں سے دیوانگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جب کتاب کے اندر کا موسم اور اُس سے باہر کا موسم ایک جیسا ہو جائے تو پڑھنے والا لازمی طور پر خود کو کتاب کے اور زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔

رات کے وقت لحاف اوڑھے جب میں ''راجہ گدھ'' پڑھ رہا ہوتا تو گھر کی دوسری منزل کے کمرے میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوتا..... رات' سردی اور لحاف' جب نعیم اور عابدہ کی ملاقاتوں سے میل کھاتے تو مجھے لگتا کہ عابدہ میرے بستر کی پائنتی کی طرف بیٹھی ہے اور اُس نے لحاف کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنے سامنے مونگ پھلیوں سے بھرا لفافہ رکھ لیتی اور جس رفتار سے وہ باتیں کر رہی ہوتی اُتنی ہی تیزی سے مونگ پھلی کھا رہی ہوتی۔ فرش مونگ پھلی کے چھلکوں سے اور کمرہ اُس کی باتوں سے بھرتا جا رہا ہوتا۔

اُس کی باتوں کا مرکز زیادہ تر اُس کا شوہر ہی ہوتا۔ وہ اُس کی توجہ نہ ملنے اور وقت نہ دینے کا گلہ کرتی رہتی۔ اُس نے اپنے شوہر کو جس خطاب سے نواز رکھا تھا وہ تھا ''ماں کا یار۔'' اُس کی باتیں سن کر میں سوچتا جو مرد اپنی عورتوں کو توجہ دینے میں ناانصافی کرتے ہوں گے وہ ساری عورتیں بھی اپنے مردوں کو شاید اسی قسم کے خطاب سے نوازتی ہوں گی۔

جب میں کتاب سے باہر نکل کر دیکھتا تو عابدہ جا چکی ہوتی اور میں پائنتی کی طرف سرک جانے والے لحاف کو جلدی سے اپنے اُوپر کھینچ لیتا۔

ہمارے آس پاس موجود عابدہ جیسی بے شمار عورتیں ایک حوالے سے تو بہت خوش نصیب ہوتی ہیں کہ اُنہیں اپنے شوہروں کی گلہ گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی مرد میسر آ جاتا ہے جبکہ مرد بے چارے اس لحاظ سے بڑے بدقسمت ہوتے ہیں

کہ وہ اپنے گھر کی بیٹھک سے لے کر دفتروں تک اور ہوٹلوں سے لے کر بازاروں تک اپنے ہی جیسے مردوں کے سامنے اپنی عورتوں کا رونا رو رہے ہوتے ہیں۔

''راجہ گدھ'' کے تین مرکزی کردار

سیمی، نعیم اور آفتاب

نعیم وہ عام سا کردار ہے جسے تخلیق کار کے قلم نے زیرو سے ہیرو بنا دیا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کے تقریباً نوجوان میں اگر نعیم کی سو فیصد خصوصیات نہیں تو ننانوے فیصد ضرور پائی جاتی ہیں۔

سیمی: اُردو ادب کے چند شاہکار کرداروں میں سے ایک ہے۔ جب میں نے ''راجہ گدھ'' میں سیمی کی داستان پڑھی تو میں حیران رہ گیا اور مجھ پر لاحاصلی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی کیونکہ یہ ایک آئیڈیل کردار ہے اور ایسے لوگ ہمیں عام طور پر اپنے آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیتے بلکہ دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے۔ اس کیفیت سے فرار حاصل کرنے کا ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں اس ناول پر شک کا اظہار کرتا اور اسے پالتا۔ مثلاً یہ بانو قدسیہ نے لکھا ہی نہیں۔ اُسے کسی اور نے لکھا ہوگا اور اُنہوں نے اسے اپنے نام سے چھپوا لیا ہوگا لیکن پھر میں نے دیکھا کہ اس شک کو پالنے سے بھی مجھے لاحاصلی کی کیفیت سے نجات نہیں ملی اور میں نامعلوم کی سولی پر بدستور لٹکا رہا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں ملتان میں بوسن روڈ کے قریب گلگشت کالونی میں رہا کرتا تھا۔ یہ 1992ء کی بات ہے۔ ایک دفعہ میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تو میں نے ہومیو پیتھک سٹور سے دوائی لی مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی اور سوچا کہ معمولی سا درد ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جب رات کے دو بجے کا وقت تھا تو معمولی سا درد اتنا بڑھ گیا کہ میں دن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس وقت کوئی رکشہ، ٹیکسی نہ ملا اور مجھے سائیکل پر بٹھا کر ایک قریبی ڈاکٹر کے گھر پر لے جایا گیا، جس کا کلینک گھر کے اندر ہی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ یہ پیٹ کا درد نہیں بلکہ گردے کا درد ہے اور پانی کی کمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اُس نے مجھے ڈرپ لگائی اور کچھ انجکشن دیے تب مجھے جا کر کچھ سکون ملا۔

اسی طرح جب ''راجہ گدھ'' پڑھنے کے بعد مجھ پر لاحاصلی طاری ہوگئی تو میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ نامعلوم سی کسک مجھے راتوں کو تڑپانے لگے اُس کا کچھ علاج ہونا چاہیے۔ تب میں اپنے ایک دیرینہ دوست راؤ ساجد کے پاس گیا۔ اُس جیسے لوگوں سے مل کر لگتا ہے کہ اس سے پہلے کی زندگی ہم نے بے وقوفوں کی سنگت میں بیٹھ کر رائیگاں ہی گزار دی ہے۔

جب میں نے راؤ ساجد کے سامنے ''راجہ گدھ'' کے بارے اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے ''تمہارے تمام شکوک بے بنیاد اور غلط ہیں۔ بانو قدسیہ فی الواقعی اُردو ادب کی ایک بہت بڑی رائٹر ہیں اور ''راجہ گدھ'' ان کی فنِ تخلیق کی معراج ہے۔''

راؤ ساجد کیونکہ بہت سمجھدار ہے اور میں اُس کی فہم وفراست کا بہت قائل ہوں اس لیے میرے پاس اُس کی بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پھر جب میں نے اُس سے کہا "یار! جب سے میں نے یہ ناول پڑھا ہے تب سے ایک بے نام اُداسی ہر طرف چھائی رہتی ہے۔ سیمی کے ملنے سے پہلے تک جتنے لوگ بھی مجھے ملے وہ سب عورت کی بے وفائی کے ڈسے ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے میں عورت کو ایک بے وفا مخلوق سمجھنے لگا تھا۔ لیکن یار! یہ سیمی تو بالکل ہی مختلف قسم کی لڑکی ہے۔ میں نے اس سے پہلے کسی لڑکی کو مرد کی محبت میں اس طرح دیوانہ ہوتے دیکھا نہ سنا۔ کیا مجھ پر چھایا حزن و ملال اس وجہ سے تو نہیں ہے؟ کیا یہ کسی آئیڈیل کو تلاش نہ کر سکنے کا لاحاصل احساس تو نہیں؟"

راؤ ساجد کہنے لگا..... "تمہاری سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ تم نے نائیلہ اور شائیلہ جیسی کہانیاں پڑھتے پڑھتے یکایک "راجہ گدھ" جیسی بڑی کتاب کو پڑھ لیا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ اس طرف آنے سے پہلے ممتاز مفتی جی کی "علی پور کا ایلی" پڑھ لیتے۔ پھر تم میں کم از کم اتنا حوصلہ پیدا ہو جاتا کہ تم اتنی بڑی کتاب کو سہار سکتے۔"

میں نے اُس سے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یار! میں سمجھتا ہوں کہ کسی کتاب کو پڑھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اُسے ناقدانہ نظر سے پڑھیں۔ اس طرح دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح اُس کتاب کی خوبیاں اور خامیاں دونوں آپ کے سامنے آ جاتی ہیں لیکن میں اسے اس طرح نہیں پڑھ سکا۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ "راجہ گدھ" کے کردار آپس میں اس طرح ملتے اور بچھڑتے ہیں جیسے یہ سب کچھ اُن کی تقدیر میں لکھا ہوا تھا اور ان مختلف کرداروں کو آپس میں ملانے اور جدا کرنے میں مصنف کی اپنی کوئی خاص کوشش کو دخل نہیں تھا۔

اس ناول کی مخصوص فضا نے مجھے ایک خاص طرح کے تحیر میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے کہ جب میں پوٹھوہار کے علاقے میں موجود ریت کے ٹیلوں کا منظر پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے آس پاس موجود تارکول کی پکی سڑکوں پر بھی ریت ہی ریت اُڑتی نظر آتی ہے اور میرے اردگرد پایا جانے والا سبزہ اور ہریالی ایسی خشک جھاڑیوں میں بدل جاتی ہیں جو برسوں سے بارش کی منتظر ہوں۔"

راؤ ساجد بڑے تحمل سے میری باتیں سن رہا تھا۔ یہ اُس کی بڑی خوبی تھی کہ وہ بہت اچھا سننے والا تھا۔ ورنہ اکثر کرم فرما تو سنانے والے ہی ملتے ہیں، سننے والا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔

میں نے اُس سے کہا..... "یار! "راجہ گدھ" میں سیمی کے پاس جو رومال ہے نا! جسے چھپانے کے لیے اُسے کوئی جگہ نہیں ملتی، مجھے لگتا ہے وہ رومال میرے گلے کا پھندا بن گیا ہے اور اب میں نہ زمین پر ہوں نہ آسمان پر۔ بس ہر وقت اس کے ساتھ خلا میں لٹکتا رہتا ہوں۔ پتہ نہیں اب اس پھندے سے میری نجات کب ممکن ہوگی۔"

وہ کہنے لگا..... "پھندے سے نکلنا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کسی نہ کسی پھندے میں بڑی مشکل سے آتا ہے آدمی۔ تمہارا سفر تو شروع ہی اب ہوا ہے۔ بس پڑھتے رہنا۔ نکلنے کا تو نہیں کہہ سکتا کسی نہ کسی طرح پار ضرور لگ جاؤ گے۔"

"یار! دُعا کرو کہ یہ پھندا میرے لیے ایسا سبق نہ بن جائے کہ جسے یاد کرنے کے بعد چھٹی نہیں ملتی۔"

اسی طرح جب 1995ء میں ممتاز مفتی صاحب سے خط و کتابت شروع ہوئی تو اُنہوں نے بھی کچھ ایسے ہی مشورے سے نوازا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے..... "پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھتے رہنا، پھر آسانی ہو جائے گی۔"

دراصل ابھی مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہی کا رومال جسے میں اپنے لیے پھندا سمجھتا ہوں، ایک دن یہی رومال نجات کا باعث بننے والا ہے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب میں نے اشفاق صاحب کا ایک مضمون پڑھا جو اُنہوں نے ''سائیں مرنا'' پر لکھا تھا۔ یہ مضمون اُن کی کتاب ''عرضِ مصنف'' میں شامل ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے لگا کہ وہ میرے گلے میں سے اُتر گیا ہے اور اب اُس نے ایک رسّی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بظاہر تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ میں نے اس رسّی کو پکڑا ہوا ہے لیکن سچی اور اصلی بات یہ ہے کہ اُس رسّی نے مجھے پکڑ رکھا ہے۔ جب میں اس رسّی کا خیال کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

بعد میں اسی رسّی کے ذریعے میں ''من چلے کا سودا'' سے گزرتے ہوئے ''زاویہ'' تک پہنچا۔

اُردو ادب میں ''راجہ گدھ'' بالکل مختلف اور منفرد ناول ہے ورنہ انتظار صاحب اور عینی صاحبہ کے ناول تو ہجرت کے مرثیے تک محدود ہیں۔ ''راجہ گدھ'' کے موضوعاتی طور پر منفرد ہونے کی وجہ سے اُس کی کراچی سے لے کر ... تک دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں 1997ء میں کراچی گیا۔ وہاں تقریباً سب احباب نے ''راجہ گدھ'' پڑھ رکھا تھا۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ سب اس سے بے حد متاثر تھے۔ یہ نظریاتی اختلاف صرف بابوں کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ان سب لوگوں کو بابوں کی باتیں سوچنے اور سمجھنے پر مجبور ضرور کرتی تھیں اور لوگ بابوں کی دانش بھری باتیں مانتے بھی تھے۔ بس ذرا اُن سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ بابوں کی باتوں سے اتفاق کرتے جاتے تو شاید اُن کی جدیدیت خطرے میں پڑ جاتی۔ اس جدیدیت کی خاطر وہ مانی جانے والی بات کو بھی رد کرتے تھے۔

آج کل تو کراچی بجلی کے بحران میں مبتلا ہے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں یہ پیارا شہر ... کی زد میں تھا اور بوری بند لاشیں ہر طرف بکھری پڑی ہوتی تھیں۔

اُن دنوں میں شارعِ فیصل پر واقع ڈرگ روڈ سٹیشن پر اُترتا اور طحہٰ اکیڈمی میری منزل ہوا کرتی جہاں میں کمپوزنگ سیکھنے جایا کرتا تھا۔ اکیڈمی کے ہیڈ سے اس لیے جلد دوستی ہو گئی کہ انہوں نے ''راجہ گدھ'' پڑھ رکھا تھا۔ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ چائے والا لڑکا آیا اور چائے رکھ کے چلا گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگے: ''یار! یہ لڑکا ایک دن چائے دینے آیا تو کہنے لگا سر! یہ جو آپ کے ریسپشن پر لڑکی بیٹھی ہوئی ہے نا یہ ساری رات مجھے سونے نہیں دیتی۔ سر! میری تو ساری رات اس کے تصور میں ہی گزر جاتی ہے۔ بھئی اس لڑکے کی بات سے مجھے یاد آیا کہ اکثر نیند تو مجھے بھی ساری رات نہیں آتی۔''

میں نے پوچھا ''وہ کیوں سر؟''

کہنے لگے ''جب سے ''راجہ گدھ'' پڑھا ہے خاص طور پر اس میں اسلام کا جو تھیسز یعنی حرام حلال کا نظریہ جس طریقے سے بیان کیا گیا وہ بہت متاثر کن ہے۔ یار اگر میں ''راجہ گدھ'' کے نظریے پر عمل کروں گا تو لوگ مجھے چھوڑ دیں گے اور اگر عمل نہیں کرتا تو میرا ضمیر مجھ پر سنگ باری کرتا رہتا ہے۔''

بہت بعد میں میں نے پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کی کتاب میں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے

طرح یاد کرو کو لوگ تمہیں دیوانہ سمجھیں۔

بس سٹاپ پر اُتر کر اکیڈمی کو جاتے ہوئے راستے میں پہلے ڈرگ سٹیشن کی بہت سی ریلوے لائنوں کو پار کرنا پڑتا تھا۔ ان لائنوں پر مال گاڑی کے بہت سے ڈبے کھڑے رہا کرتے تھے۔ رات کے وقت جب بھی میرا ان لائنوں پر سے گزر ہوتا تو رات کے اندھیرے میں کسی پٹڑی پر کھڑے ڈبے کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ ضرور یاد آتا۔ دراصل وہ قصہ اس علاقے میں کسی روایت کی طرح سینہ بہ سینہ چلتا ہوا مجھ تک پہنچا تھا۔

ایک روز رات کے پچھلے پہر جب چور اور نمازی اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔

پتہ نہیں وہ ریلوے پولیس کا سپاہی تھا' کوئی رات کی ڈیوٹی کا گارڈ تھا یا کوئی عام پولیس والا تھا۔ اُس نے ایک خالی ٹین کا ڈبہ لے کر اُسے رسّی سے باندھا اور مال گاڑی کی ایک بوگی کی طرف چل پڑا۔ اُس کا اندازہ تھا وہ بوگی تیل یا ڈیزل سے بھری ہوئی ہے اور وہ آسانی اس میں سے ایک کنستر بھر لے گا۔ بوگی کے پچھلے حصے کی طرف موجود تیل کے اخراج کا راستہ باوجود کوشش کے اُس سے کھل نہ سکا ہوگا۔ پھر وہ بوگی کے اُوپر چڑھا ہوگا اور جہاں سے بوگی میں تیل ڈالا جاتا ہے وہاں لگے ہوئے چوڑے ڈھکن کو کھولنے میں وہ کامیاب ہو گیا ہوگا۔

جب اُس نے کنستر بوگی میں ڈالا تو تیل کی سطح اُس کے اندازے سے کافی نیچے تھی۔ لہٰذا کنستر کو تیل تک پہنچانے کے لیے اُسے خود بھی بوگی کے اندر جھکنا پڑا ہوگا۔ نجانے رات کا اندھیرا تھا' نیند کا خمار تھا یا تیل کی پھسلن' بیچارہ سپاہی' رات کی ڈیوٹی کرنے والا گارڈ یا جو کوئی بھی وہ تھا' اپنے کنستر کے ساتھ خود بھی..... بوگی کے اندر پھسل گیا۔ یہ اس کی دوسری غلطی تھی۔

اس نے کنستر کو پکڑنے کے لیے تو اس کے ساتھ رسّی باندھ رکھی تھی لیکن خود کو کسی رسّی سے باندھنا بھول گیا تھا' جس کے سہارے وہ بوگی سے باہر نکل سکتا۔ کئی دن بعد یا جب بھی کسی نے کھلے ڈھکن کا جائزہ لیا ہوگا تب جا کر اس بے چارے کی لاش باہر نکالی جا سکی ہوگی۔ ہمارے ہاں کروڑوں اور اربوں کے گھپلے ہوتے رہتے ہیں اور کوئی نہیں پکڑا جاتا اور جب پکڑ ہونے پر آتی ہے تو پھر ایک تیل کے کنستر پر ایسی پکڑ ہو جاتی ہے۔ تیل کے بجائے لاش ہی واپس گھر جاتی ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ کبھی کبھی کسی روز جب ہم گھر سے نکلتے ہیں تو اُس دن ہم اپنے بہت سارے رُکے ہوئے ضروری کام کامیابی سے نپٹا لیتے ہیں اور شام کو گھر واپسی پر ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ آج کا دن تو ہمارا دن تھا۔ بالکل اسی طرح جو پکڑے نہیں جاتے اُن کے لیے وقت کی رسّی دراز ہوتی ہے اور پکڑے جانے والے جس دن گرفت میں آجاتے ہیں وہ دن اُن کا دن نہیں ہوتا۔

میں جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ دنیا میرے لیے ایک بہت بڑی ساری بوگی ہے اور میں اپنے لیے اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے ایک کنستر بھرنے کے لیے اس میں اُترا ہوا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں نے کنستر کو پکڑنے کے لیے جو رسّی باندھ رکھی ہے، وہ بڑی کمزور اور پھسلنے والی ہے اس لیے باوجود کوشش کے کبھی پورا کنستر بھرتا ہی نہیں ہے۔ کبھی آدھا اور اکثر تو آدھے سے بھی کم پر گزارا کرنا پڑتا ہے، لیکن جس ڈور نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے وہ بڑی مضبوط ہے۔

میں اس وقت جہاں کھڑا ہوں یہ دنیاوی ضرورتوں سے بھری ایک بوگی ہے اور ان چھوٹی موٹی ضرورتوں نے میرے چاروں طرف اندھیرا کر رکھا ہے، لیکن جب میں خود سے بندھی اُس مضبوط ڈور کے آخری سرے کی طرف دیکھتا ہوں تو وہاں مجھے روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ایک دن میں اس ڈور کے سہارے خود کو ان ضرورتوں سے بھری بوگی کے اندھیروں سے نکالنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہ مضبوط ڈور ''راجہ گدھ'' سے شروع ہو کر مفتی جی کی ''لبیک'' سے ہوتی ہوئی اشفاق احمد صاحب کے ''زاویہ'' تک جاتی ہے اور اب خاں صاحب کے یہ سلسلہ موقوف نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ اب پروفیسر احمد رفیق اختر کی کتابیں اپنی روشنی سے اس سلسلے کو جاری کر رہی ہیں۔

آخر میں مجھے اُن سب ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے ایسی بصیرت افروز کتب تخلیق کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں سنگ میل پبلشرز کے افضال احمد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے مجھے اُن لائق تحسین کتب کو پڑھنے کا موقع فراہم کیا اور سب سے بڑھ کر میں اللہ کا احسان مند ہوں کہ جس نے مجھے اُن کتب کو سمجھنے کا شعور عطا فرمایا۔

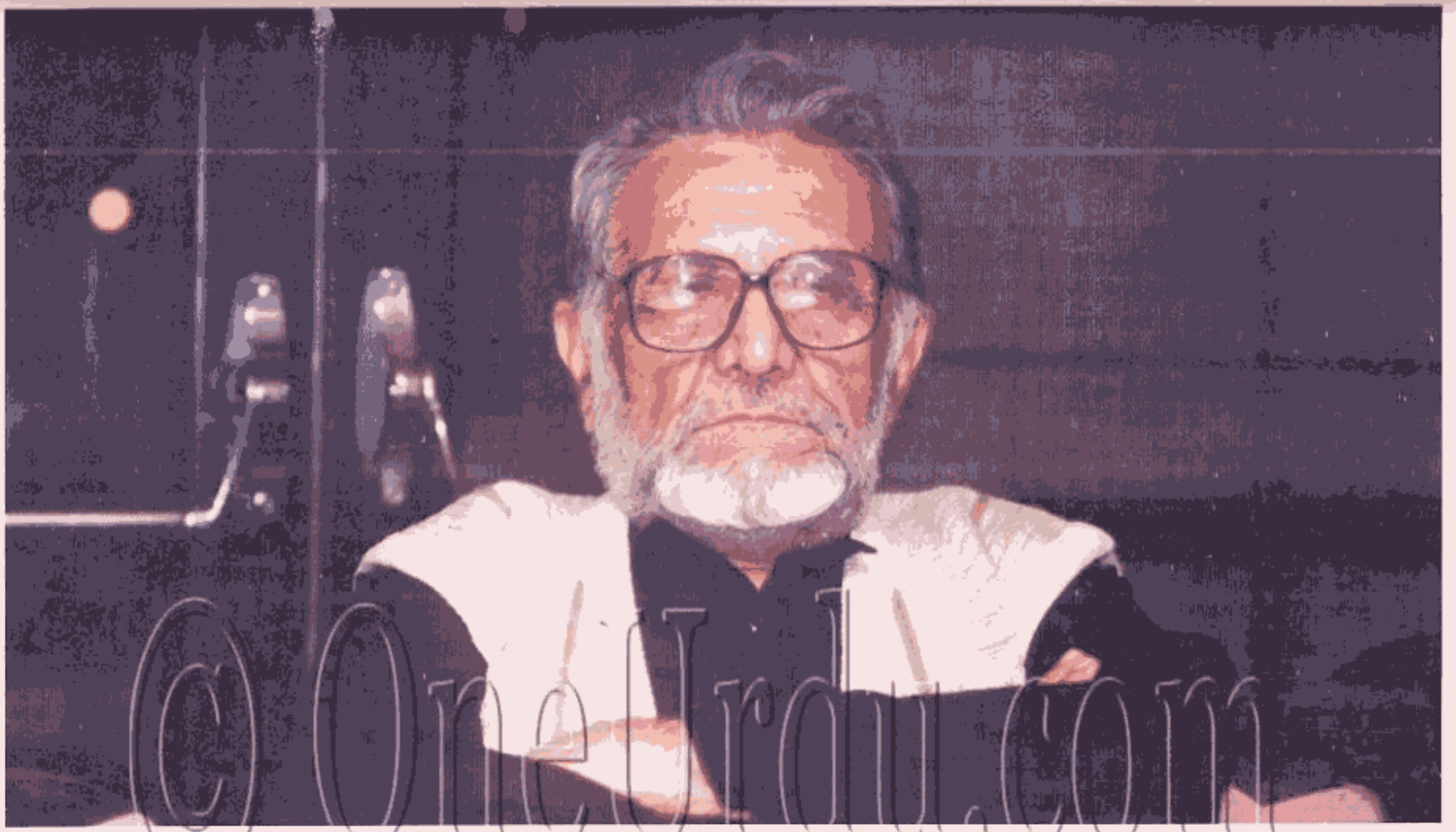

اشفاق احمد (2002ء)

OneUrdu.com

اشفاق احمد (بچپن)

©OneUrdu.com

اشفاق احمد

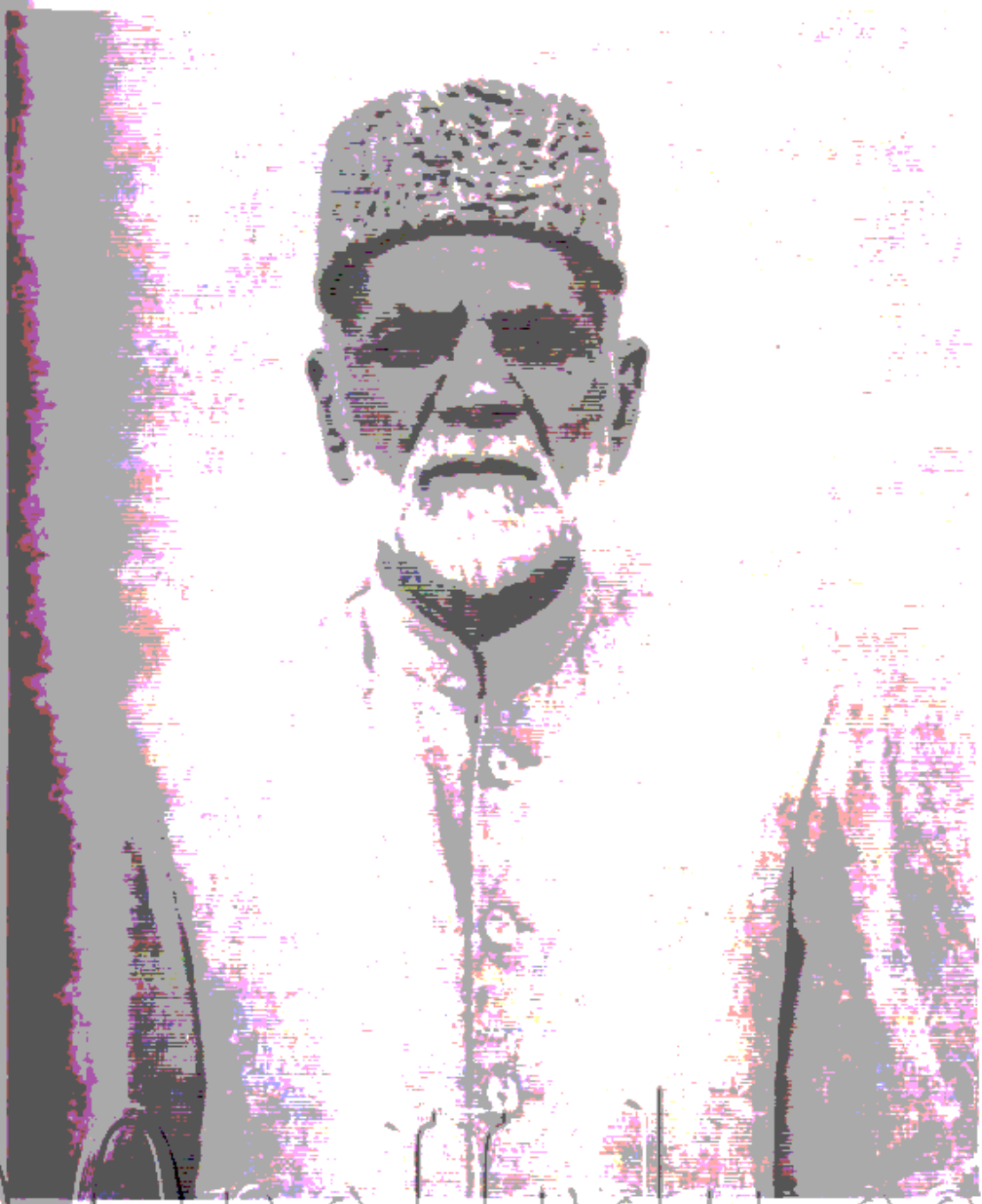

بابا جی محمد خاں (ڈنگر ڈاکٹر) ــــ والد اشفاق احمد

©oneurdu.com

اماں جی سردار بیگم ـــــ والدہ جناب اشفاق احمد

ماسی رشیدہ (اماں جی کی چھوٹی بہن) ممتاز (ماسی رشیدہ کی بہو)
اُنزلا (گود میں) ماسی جی کی پوتی

121 سی خاں صاحب کے دوست ماسی رشیدہ کے بیٹے فہیم احمد خاں، ممتاز (بیگم فہیم ماسی رشیدہ کی بہو